(غلام گردش)

موسیقار

استاد سلیم اقبال سے ملاقات کیسے ہوئی۔ وجہ کیا تھی۔ اس معاملے کا قطعاً ادراک نہیں ہے۔ 1979 میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا نیو ہاسٹل بالکل اسی جگہ پر تھا، جہاں آج موجود ہے۔ نیو ہاسٹل اسلیے کہلاتا تھا کہ صرف چند سال پرانا تھا۔ خیر اب تو یہ ہاسٹل تیس چالیس برس کا نوجوان بوڑھا ہے۔ ایک دن شام کو مجھے کوئی چھوٹا سا کام تھا۔ شائد کوئی چیز خریدنی تھی۔ گوالمنڈی جو کہ اب فوڈ سٹریٹ کہلاتی ہے، اُس وقت بھی انسانی زندگی سے بھرپور تھی۔ گوالمنڈی کے آخر میں پہنچا تو ساز کی خوبصورت آواز سنائی دی۔ ذرا آگے جا کر دیکھا تو ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں مختلف طرح کے ساز لٹکے ہوئے تھے۔ دیدہ زیب ستار اور سارنگیاں دیوار کے ساتھ آویزاں تھے۔ کافی حیرت سی ہوئی کہ پہلے یہاں نظر کیوں نہیں پڑی۔ دکان کے عین درمیان میں ایک نوجوان لکڑی کے مختلف ٹکڑوں کو عجیب انداز سے جوڑ رہا تھا۔ اسکے اوپر باریک سی تاریں بھی لگا رہا تھا۔ دراصل یہ ستار کی ابتدائی شکل تھی۔ اس دکان کے کونے میں ایک لحیم شحیم آدمی خاموشی سے ستار بجا رہا تھا۔ اس شخص نے سادہ سا کُرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ چہرے پر نظر کی عینک لگی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں ایک مدبر قسم کا پروفیسر معلوم پڑتا تھا۔

دکان کے سامنے کھڑے ہوئے چند منٹ گزرے تھے تو ایک نوجوان دکان میں داخل ہونے لگا۔ مجھے کہتا ہے کہ آپ اندر آجاؤ۔ میرے لیے یہ ماحول بالکل اجنبی سا تھا۔ کبھی ستار بنتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی کبھی ایک پروفیسر کو ستار بجاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اندر دو سٹول پڑے تھے۔ ایک سٹول پر اجازت لیکر بیٹھ گیا۔ کونے میں بیٹھا بزرگ آدمی ستار بجانے میں حد درجہ مصروف تھا۔ کبھی آنکھیں کھول لیتا تھا اور کبھی بند کر لیتا تھا۔ پکے رنگ کا یہ آدمی میرے لیے ایک نامانوس سا اجنبی تھا۔ خیر باتیں شروع ہوگئیں۔ ستار بنانے والے نے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ جو نوجوان دکان میں داخل ہوا تھا، وہ بھی پوچھنے لگا کہ کیا مجھے موسیقی سے کوئی شغف ہے۔ خیر تعارف پر پتہ چلا کہ نوجوان کا نام حنیف ہے اور یہ دکان اسکے بڑے بھائی کی تھی۔ حنیف، کونے میں بیٹھے ہوئے مدبر آدمی سے گانے کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ حنیف غضب کا گلوکار تھا۔ خیر کونے میں بیٹھا ہوا شخص باتوں میں ہمارے ساتھ شامل ہوگیا۔ بتانے لگا کہ میرا نام سلیم اقبال ہے اور میوزک ڈائریکٹر ہوں۔ مجھے نام سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حنیف کو ہاسٹل کا کمرہ نمبر بتایا اور کہا کہ جب بھی وقت ہو، ہاسٹل آجائے۔ چند دن بعد، شام کو حنیف میرے کمرے میں آگیا۔ اسکے ساتھ سلیم اقبال بھی تھے۔ دوسری ملاقات میں بھی قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ یہ بوڑھا سا انسان کتنے اعلیٰ درجہ کا میوزک ڈائریکٹر ہے۔ یہ بھی علم نہیں تھا کہ میوزک ڈائریکٹر کیا ہوتا ہے۔ چند دنوں بعد حنیف دکان سے پرانا سا ہارمونیم لے آیا اور کمرے میں رکھ دیا۔ جب بھی موڈ میں ہوتا تو کمال کی غزلیں سناتا۔ سلیم اقبال صاحب نے بھی اب ہاسٹل آنا شروع کر دیا۔ اس طرح تین چار مہینے گزر گئے۔ ہوتا یہ تھا کہ ہفتہ میں تین چار بار سلیم اقبال دوپہر کو ہاسٹل آجاتے تھے۔ نیچے لگے ہوئے اخباروں کو پڑھتے تھے۔ اگر میں کمرے میں نہ آیا ہوں تو بند ہاسٹل کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر انتظار کرتے تھے۔ یقین فرمایئے کہ میں اس عظیم ڈائریکٹر کے مقام سے مکمل طور پر نابلد تھا۔ سلیم اقبال بڑے طریقے سے کمرے میں آکر ہارمونیم پر گانا شروع کر دیتے

تھے۔

ایک دن ارشد بٹ کے گھر گیا تو ارشد کمرے میں بیٹھا بادل ناخواستہ میڈیکل کی ضخیم کتابیں پڑھنے میں مصروف تھا۔ارشد بٹ علامہ اقبال میڈیکل کالج میں پڑھ رہا تھا۔ جناح کالونی سے ارشد کے والد ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ ریگل چوک سے تھوڑا آگے گھر خریدا تھا۔ والد کی شدید خواہش تھی کہ بیٹا ڈاکٹر بنے۔ارشد بنیادی طور پر ادب اور موسیقی کا انسان تھا اور ہے۔اسے ہمیشہ مردِ صحرا لکھتا ہوں۔اسلیے کہ مجھے موسیقی کی بنیاد سے متعارف کروانے والا یہی مردِ صحرا ہے۔عرض کرتا چلوں۔ارشد کے والد محترم، ایس۔ڈی۔ بٹ صاحب امریکہ سے پی۔ایچ۔ڈی تھے۔کیمسٹری جیسے مشکل مضمون میں ڈاکٹریت حاصل کی۔ پچاس کی دہائی میں امریکہ جا کر علم حاصل کرنے والے بہت کم لوگ تھے۔ بڑے بٹ صاحب کو یونیورسٹی نے امریکی شہریت لینے کا کہا۔ساٹھ ستر برس پہلے امریکی شہریت حاصل کرنا بہت آسان تھی۔حد درجہ آسان۔ بڑے بٹ صاحب نے یونیورسٹی کے ڈین کو یہ کہا کہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اپنے آبائی ملک یعنی پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔امریکی شہریت سے انکار کر کے لائل پور کی زرعی یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا۔آخری دم تک پڑھاتے رہے۔انتہائی وجیہہ اور بلند قامت شخصیت۔جب جناح کالونی کی کسی سڑک سے گزرتے تو ہماری عمر کے بچے انکے رعب کی بدولت آگے پیچھے ہو جاتے۔خیر ارشد بٹ سے باتوں باتوں میں کہا کہ ایک موسیقار سلیم اقبال چند مہینوں سے میرے کمرے میں آرہے ہیں۔آج تک یاد ہے۔مردِ صحرا ایک دم چوکنا ہو گیا۔کتابیں ایک طرف رکھ دیں۔پوچھنے لگا، کون، کس کی بات کر رہے ہو۔جب دوبارہ سلیم اقبال کا بتایا تو حیرت سے پوچھنے لگا کہ کیا تم استاد جی کو جانتے ہو۔میرا جواب نفی میں تھا۔ارشد کو تو ایسے ہوا جیسے ایک کرنٹ لگا ہو۔ بتانے لگا کہ نہ صرف پاکستان، بلکہ سلیم اقبال تو برصغیر کے نایاب اور بلند پایہ موسیقاروں میں سے ایک ہیں۔مردِ صحرا نے مجھے استاد جی کی دس بارہ پرانے نغموں کی دھنیں سنانی شروع کر دیں۔ارشد کا بہت بڑا وصف ہے کہ اسے موسیقی پر مکمل عبور حاصل ہے۔آج بھی اسکے سامنے کسی غزل یا نغمہ کا ذکر کریں۔وہ شاعر، موسیقار اور گلوکار کے متعلق سب کچھ بتائیگا۔انتہائی فن شناس انسان ہے۔ارشد کو خیر یقین نہ آیا کہ سلیم اقبال ہاسٹل آتے رہتے ہیں۔اگلے دن وقت مقرر ہوا۔تقریباً شام کے چار پانچ بجے ہاسٹل میں اکٹھے ہو گئے۔سلیم اقبال صاحب بھی آ گئے۔مردِ صحرا اور سلیم اقبال کی باہمی گفتگو اس درجہ دلچسپ اور اعلیٰ تھی کہ واقعی حیران سا ہو گیا۔ پتہ چلا کہ، آفاقی نغمہ "اے راہِ حق کے شہیدوں، وفا کی تصویرو" کی دھن سلیم صاحب نے ترتیب دی تھی۔ پنجابی کا مشہور ترین نغمہ، "دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا" بھی انہی کی دھن تھی۔ "سانوں نہر والے پُل تے بلا کے" بھی اسی عظیم موسیقار کے ذہن میں ترتیب ہوا تھا۔اسکے علاوہ سینکڑوں ایسے زبان زد عام نغمے تھے جو اسی عظیم انسان نے ترتیب دیے تھے۔خیر اب سلیم اقبال کی قدر و قیمت کا بتدریج اندازہ شروع ہو گیا۔

ایک دن امتحان سے فارغ ہو کر کمرے میں بیٹھا تھا، سلیم صاحب آئے اور کہا کہ ریڈیو پاکستان چلتے ہیں۔میرے پاس موٹر سائیکل تھی۔ہم دونوں شملہ پہاڑی کے ساتھ ریڈیو پاکستان کی بلڈنگ میں پہنچ گئے۔انہیں آدھے گھنٹے کا کوئی کام تھا۔اسکے بعد دونوں کینٹین میں آ گئے۔وہاں غلام علی بیٹھا ہوا تھا۔یہ 80-1979 کی بات ہے۔غلام علی اس وقت تک شہرت کے زینہ پر قدم رکھ

چکا تھا۔حد درجہ عاجز اور ملنسار انسان۔میں نے فرمائش کی کہ غلام علی صاحب کچھ سنایئے۔کینٹین میں یہ فرمائش کافی حد تک غیر مناسب تھی۔غلام علی نے بالکل برا نہیں منایا۔انتہائی تمیز سے سلیم اقبال سے اجازت لی۔لکڑی کی میز پر اپنے ہاتھوں سے ایک آواز پیدا کی اور پھر اس نے جادوئی آواز سے سماں باندھ دیا۔اپنی تین چار شہرہ آفاق غزلیں سنائیں کہ لطف آ گیا۔اسکے بعد ہم سب نے بوسیدہ سے برتنوں میں چائے پی اور ہاسٹل واپس آ گئے۔میں نے محسوس کیا کہ بڑے انسان اپنے رویہ میں بھی بڑے ہوتے ہیں۔شہرت، دولت یا غربت انکے لیے بے معنی سی ہوتی ہے۔ان لوگوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔الگ تھلگ۔غیر حقیقی مگر فن سے لبریز کائنات۔تمام اہل فن لوگ حقیقت اور غیر حقیقت کے درمیان بے نیازی سے زندگی گزارتے ہیں۔کسی انعام یا صلہ کی توقع کے بغیر۔

خیر سلیم صاحب اب اکثر ہاسٹل آ جاتے تھے۔کمرے میں ایک دن لائل پور سے ظفر آیا ہوا تھا۔احمد فراز کی ایک غزل کی دھن بن رہی تھی۔ظفر نے اس دھن پر انتہائی اچھے طریقے سے غزل کو گانا شروع کر دیا۔سلیم صاحب نے ظفر کو مشورہ دیا کہ باقاعدہ موسیقی کی تعلیم حاصل کرے۔ظفر تقریباً دو سے تین سال اس عظیم موسیقار سے علم حاصل کرتا رہا۔ظفر نے باقاعدہ کئی مقامات پر بہت اچھا گانا شروع کر دیا۔آج کل نیویارک میں ہے۔جب بھی پاکستان آتا ہے تو سلیم اقبال کی تیار کردہ غزلیں ضرور سناتا ہے۔ظفر بھی ایک عجیب سا شخص ہے۔لاابالی نظر آنے والا انتہائی سنجیدہ شخص۔پر بہار اور قہقہے بکھیرنے والا انسان۔سلیم اقبال صاحب میں اس درجہ قناعت اور سنجیدگی تھی کہ کسی پر بوجھ نہیں بنتے تھے۔ایک دوپہر کو گوالمنڈی میں کھانے کا وقت ہو گیا۔انہوں نے ایک نان لیا اور آلو کی ٹکی کے ساتھ خاموشی سے کھا لیا۔پانی پیتے ہوئے خدا کا بار بار شکر ادا کر رہے تھے۔حد درجہ سادہ اور شریف انسان۔کبھی کسی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ اسکے دل میں موسیقی کا ایک سمندر بند ہے۔جس وقت ان سے ملاقات ہوئی، اس وقت ان پر زوال کا وقت تھا۔شہرت اور آسودگی کی دیوی انکی زندگی سے بہت دور جا چکی تھی۔مگر میں نے کبھی بھی انہیں شکوہ کرتے نہیں سنا۔وہ ہر وقت خدا کا شکر ادا کرتے رہتے تھے۔

سلیم اقبال جیسا بھرپور موسیقار انتہائی مشکل حالات سے دوچار رہا۔اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ زندگی کی دوڑ اور گھریلو ضروریات کو کیسے باہمی طور پر باندھ کر رکھے۔شدید ناقدری اور زمانے کی سفاکی سے بے بس انسان ایک دن فالج کا شکار ہو گیا۔کوئی اسے پوچھنے نہ گیا۔کوئی اسکی مالی امداد کیلئے نہ پہنچا۔اسی رنج و الم اور بے بسی میں سلیم اقبال دنیا سے چلا گیا۔اسکی بنائی ہوئی دھن "اے راہِ حق کے شہیدوں، وفا کی تصویرو" پر لوگ آنسو بہاتے ہیں۔جذبات میں آ کر روتے ہیں۔مگر کوئی بھی اس جید موسیقار کو یاد نہیں کرتا، جو اپنی دھن کا خالق تھا۔ہم ہر شعبے میں ناقدری کرنے والے لوگ ہیں۔سلیم اقبال بھی اسی ناقدری کا مسلسل شکار رہا۔اسے آج تک اسکا مقام نہیں مل سکا۔مگر یہاں ہر بڑے آدمی کو اسکا مقام کہاں ملتا ہے۔موسیقار کیا، یہاں تمام اہل فن اپنی اپنی جگہ الیمہ کی تصویر ہیں۔دولت تو دور کی بات ہے، عزت کی تلاش میں ہی فنا کے راستے پر چل دوڑتے ہیں۔سلیم اقبال عظیم، موسیقار اسی راہِ فنا کا مسافر تھا!

راؤ منظر حیات